تنظیمِ اسلامی کا پیغام

نظامِ خلافت کا قیام

مطالعۂ قرآنِ حکیم کا

منتخب نصاب نمبر 2

درس - 4

بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں
اسلامی انقلاب کے لیے
طریق کار اور آخری اقدام

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی

درس ٤

بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لیے طریق کار اور آخری اقدام

انجینئر نوید احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْکُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ؕ
کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ
اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ
وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ
وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ
الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ
الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴿۱۱۲﴾﴾
(التوبۃ)

☆ تمہیدی نکات:

(۱) منتخب نصاب نمبر ۲ کا درسِ چہارم سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ اور سورۃ التوبۃ کی آیات ۱۱۱ تا ۱۱۲ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

(۲) منتخب نصاب نمبر ۲ کے درسِ اوّل میں چند مقاماتِ قرآنی کے ذریعے دینی فرائض کا جامع تصور واضح کیا گیا۔ درسِ دوم میں دینی فرائض میں سے خاص طور پر اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کی فرضیت کو نمایاں کیا گیا۔ اِس کے بعد درسِ سوم میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے مقصد یعنی قیامِ عدل کی وضاحت کی گئی۔ اب درسِ چہارم میں ہم موجودہ بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اقامتِ دین کے طریق کار اور اِس حوالے سے آخری اقدام کو سمجھیں گے۔

(۳) گزشتہ دروس سے یہ بات معین ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور نجاتِ اُخروی کے حصول کے لیے اِس دنیا میں ہماری جدّ وجہد کا اصل ہدف اللہ کے دین کا غلبہ یعنی ایسے نظام کا بالفعل قیام ہے جس میں اللہ کو حاکمِ حقیقی تسلیم کیا جائے اور اُسی کی بڑائی جاری وساری ہو۔ اِس کے لیے پہلے سے رائج نظام کو تلپٹ کرنا ہوگا اور پھر متبادل نظام قائم و نافذ کرنا ہوگا۔ اِس عمل کے لیے ایک جدید اصطلاح ''اسلامی انقلاب'' ہے۔ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے طریق کار کے بارے میں اصولی ہدایت قرآنِ حکیم سے ملتی ہے جو اِس درس میں ہم سمجھیں گے۔ البتہ اِس کے لیے عملی رہنمائی ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے حاصل ہوگی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ تاریخ انسانی کی وہ واحد ہستی ہیں کہ جنہوں نے اقامتِ دین کے لیے تن تنہا انقلابی جدّ وجہد کا آغاز کیا اور محض اکیس برس کے عرصہ میں بالفعل انقلاب برپا کر کے اقامتِ دین کی منزل سر کر لی۔

اب ہم ان آیاتِ مبارکہ پر غور وفکر کرتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران' آیات ۱۰۲۔۱۰۴

سورۂ آلِ عمران کی تین آیات پر مشتمل یہ مقام قرآنِ مجید کے جامع ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اِن تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کے لیے فوز وفلاح کے حصول کا سہ نکاتی لائحۂ عمل ایک منطقی تدریج کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلی آیت میں اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد

کو ذاتی اصلاح کی دعوت دی گئی ہے۔ دوسری آیت میں افراد کو قرآن حکیم کو مرکز و محور بناتے ہوئے ایک منظّم جماعت کی صورت اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تیسری آیت میں جماعت کو معاشرے کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں کو دائمی فوز وفلاح کی نوید سنائی گئی ہے۔

☆ آیت ۱۰۲

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو!''...... ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ﴾ ''اللہ کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اُس کی نافرمانی سے بچنے کا حق ہے''...... ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''اور ہرگز نہ مرنا مگر فرمانبرداری کی حالت میں''۔

◆ اِس آیت میں بڑے تاکیدی اسلوب میں ہر مسلمان فرد کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ہے فوز وفلاح کے حصول کے لیے لائحۂ عمل کا پہلا نکتہ۔ تقویٰ دین کی اصل روح ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی ہیں بچنا۔ اصطلاحی طور پر اِس کا مفہوم ہے اللہ کی نافرمانی یا اللہ کی ناراضگی سے بچنا۔ انگریزی زبان میں ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو'' کا بڑا مناسب ترجمہ کیا جاتا ہے "Have regard for Allah."۔ البتہ اللہ کا تقویٰ انسان اختیار نہیں کر سکتا جب تک اُسے اللہ کے سامنے حاضری کا خوف اور ڈر نہ ہو۔ اِسی لیے تقویٰ کے معنی کر دیے جاتے ہیں ڈرنا۔ اگر اللہ کے سامنے پیشی اور جوابدہی کا ڈر نہ ہو تو انسان کو اُس کا علم اور عقل' اللہ کی اطاعت سے بچنے کے لیے چور دروازے دکھاتے اور طرح طرح کے حیلے سجھاتے ہیں۔

◆ تقویٰ کی بڑی عمدہ وضاحت امام ابنِ کثیرؒ نے سورۃ البقرۃ کی تفسیر کے آغاز میں حضرت اُبی بن کعبؓ کے الفاظ میں نقل کی ہے :

سَاَلَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ (اُبَیَّ بْنِ کَعْبٍ رضی اللہ عنہ) عَنِ التَّقْوٰی' فَقَالَ لَـہٗ : اَمَا سَلَکْتَ طَرِیْقًا ذَا شَوْکٍ؟ قَالَ : بَلٰی' قَالَ : فَمَا عَمِلْتَ؟ قَالَ : شَمَّرْتُ وَاجْتَھَدْتُّ' قَالَ : فَذٰلِکَ التَّقْوٰی!

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے) پوچھا: تقویٰ کیا ہے؟ تو اُنہوں نے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ ایسے کسی راستہ سے گزرے ہیں جو کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان ہو؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا جی ہاں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ نے سوال کیا کہ پھر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں اپنا لباس سمیٹتا ہوں اور جسم کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا: یہی تو تقویٰ ہے!''

◆ تقویٰ دراصل ایک باطنی کیفیت کا نام ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اپنے قلبِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا'' اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا'' یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ یہ انسان کو ایک خاص مثبت رویہ (positive atitude) عطا کرتا ہے۔ اِس رویہ کے تحت انسان پر ہر وقت خدا خوفی اور اُخروی جواب دہی کا احساس طاری رہتا ہے' لہٰذا وہ اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ اگر نافرمانی ہو ہی جائے تو توبہ کرتا ہے۔ اگر کوئی انسان اسے اُس کی غلطی سے آگاہ کرے تو وہ اسے انا کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ غلطی پر متوجہ کرنے والے کا ممنون ہوتا ہے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ تقویٰ نہ ہو تو انسان اپنی غلطی مانتا ہی نہیں' یا پھر غلطی کی توجیہات پیش کرتا ہے۔

◆ اِس آیت میں فرمایا کہ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' جیسا کہ اُس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے''۔ بلاشبہ یہ تاکید کا آخری اسلوب ہے اور اِس مقام تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ اصول بہرحال یہی ہے کہ آئیڈیل اونچا ہونا چاہیے اور نگاہ بلند ہونی چاہیے۔ اب جہاں تک کوئی رسائی حاصل کر سکے یہ اُس کی ہمت ہے۔ یہ حکم سن کر صحابہ کرامؓ گھبرا گئے تھے کہ کس کے لیے ممکن ہے کہ اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکے؟ البتہ جب سورۃ التغابن کی آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تم استطاعت رکھتے ہو' تو اُن کی جان میں جان آئی۔

◆ ''اللہ کا تقویٰ ایسے اختیار کرنا جیسا کہ اُس کا حق ہے'' سے مراد یہ ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی امکانی حد تک کوشش کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ معاملات میں تو اللہ کا کہنا مانا جا رہا ہو اور کچھ میں اللہ کی نافرمانی کی جا رہی ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''تو کیا تم کتاب کی کچھ باتوں کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ تو کچھ بدلہ نہیں ہے تم میں سے اُس کا جو کوئی بھی ایسا کرے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں' اور قیامت کے دن وہ لوٹائے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف' اور اللہ غافل نہیں ہے اُس عمل

سے جوتم کر رہے ہو‘‘۔

آج دنیا میں اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا سبب یہی ہے کہ ہماری اکثریت بعض معاملات میں اللہ کی نافرمانی سے بچتی ہے اور بعض میں نہیں۔ اگر ہم نے اپنی روش نہ بدلی تو آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لوٹائے جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ ہمیں اپنی مکمل فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

◆ اِس آیت میں دوسرا حکم ہے ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ’’اور ہرگز نہ مرنا‘ مگر حالتِ اسلام میں‘‘۔ اسلام کا فقہی و قانونی مفہوم ہے مسلمان ہونا‘ اور اس کا لغوی مفہوم ہے فرمانبردار ہونا۔ اگر یہاں اسلام کا اصطلاحی مفہوم مراد لیا جائے تو آیت کے پہلے حصے کا زورِ بیان غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں جو تاکیدی اسلوب ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ اُس کا تقاضا ہے کہ یہاں اسلام کا لغوی مفہوم مراد لیا جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی نصیحت یہ ہے کہ ’’تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں‘‘۔ جب کوئی شخص گناہِ کبیرہ کر رہا ہوتا ہے تو قانونی اعتبار سے مسلمان ہی ہوتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے حالتِ ایمان میں نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

((لَایَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِی وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

’’کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا‘ اور کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا‘ اور کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا‘‘۔

حقیقت کے اعتبار سے نافرمانی کی حالت میں موت بڑی حسرت ناک موت ہے۔ تصور کیجئے کہ اگر ایک شخص کی عین عمل زنا کے دوران جان سلب کر لی جائے تو یہ کتنی عبرت ناک موت ہوگی! پھر نوٹ فرمائیے کہ ایک ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق سود کھانے کا گناہ زنا سے بھی کئی گنا بڑھ کر ہے :

((دِرْھَمُ رِبًا یَّاْکُلُہُ الرَّجُلُ وَ ھُوَ یَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّۃٍ وَّ ثَلَاثِیْنَ زَنْیَۃً)) (۲)

’’سود کا ایک درہم جس کو آدمی جان بوجھ کر کھاتا ہے چھتیس بار زنا سے زیادہ گناہ رکھتا ہے‘‘۔

ایک اور حدیثِ نبوی ﷺ ہے :

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا‘ اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (۳)

’’سود خوری کے گناہ کے ستر حصے ہیں‘ ان میں سب سے کم ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں کے ساتھ نکاح کر لے‘‘۔

اِس حدیث کی روشنی میں عملِ زنا اور عملِ سود میں کیا نسبت قائم ہو سکتی ہے! ہزار گنا بھی کہا جائے تو کم ہے۔ عملِ زنا تو ہمیں طبعاً بہت ہی بُرا لگتا ہے‘ اِس لیے کہ اسے برا سمجھنا ہماری روایت کا ایک جزو بن گیا ہے‘ جبکہ ہماری اکثریت سود جیسے گناہ میں ملوث ہے اور سود کھاتے ہوئے مرنا‘ اِس تصور پر ہمیں جھرجھری نہیں آتی اور ناگواری محسوس نہیں ہوتی۔ اِس کے علاوہ کئی اور گناہ ہیں جن کا ارتکاب ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے‘ مثلاً عبادات سے غفلت‘ بے پردگی و بے حیائی‘ حرام کاروبار کی مختلف صورتیں اور دیگر منکرات وغیرہ۔ اللہ ہمیں موت کا وقت آنے سے پہلے پہلے اِن گناہوں کو ترک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

◆ ’’تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ فرمانبرداری میں‘‘ کا حکم تقاضا کر رہا ہے کہ ایک ایک لمحہ چوکس اور چوکنے ہو کر احتیاط سے بسر کیا جائے۔ کہیں کوئی لمحہ حالت نافرمانی میں نہ گزرے۔ کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں کہ کس لمحے اُس کی موت آ جائے!

☆ آیت ۱۰۳

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ’’پکڑ لو مضبوطی کے ساتھ اللہ کی رسّی کو سب کے سب مل کر‘‘ ..... ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ’’اور جدا جدا نہ ہو جاؤ‘‘ ..... ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ ’’اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو‘‘ ..... ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ ’’جب تم باہم دشمن تھے‘‘ ..... ﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ ’’تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی‘‘ ..... ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ ’’پھر تم ہو گئے اُس کی نعمت سے بھائی بھائی‘‘ ..... ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ ’’اور تم تھے آگ کے گڑھے کے کنارے پر‘‘ ..... ﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ’’پس اُس نے تمہیں اُس سے بچا لیا‘‘ ..... ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ’’اِسی طرح اللہ واضح کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیات‘‘ ..... ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ ’’تاکہ تم ہدایت حاصل کرو‘‘۔

◆ اِس آیت میں اہلِ ایمان کو ہدایت کے دوسرے نکتہ کے طور پر باہم جمع ہو کر ایک اجتماعیت قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ افراد کو جمع کر کے اُن کی شیرازہ بندی سے ایک قوت وجود میں آتی ہے۔ اہلِ ایمان کی شیرازہ بندی کس بنیاد پر ہوگی؟ اُن کو جوڑنے والی شے کون سی ہے؟ یہ

شے ہے ''حبل اللہ'' یعنی اللہ کی رسّی۔ حکم دیا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ کہ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔ حبل اللہ سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ ارشاداتِ نبوی ہیں:

((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ))(٤)

''یہی (قرآن مجید) اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔

((كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِّنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ))(٥)

''اللہ کی کتاب تنی ہوئی رسّی ہے آسمان سے زمین کی طرف''۔

گویا مسلمانوں کی باہم شیرازہ بندی کی بنیاد قرآنِ حکیم ہے۔

◆ **اعتصام** کا لفظ ع ص م سے بنا ہے۔ عَصَمَ يَعْصِمُ کے معنی ہیں ''کسی کو بچانا''۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٧ میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ''اللہ آپ ﷺ کو بچائے گا (یعنی آپ ﷺ کی حفاظت فرمائے گا) لوگوں سے''۔ ع ص م سے بابِ اِفتعال میں مصدر بنتا ہے اِعتِصام۔ اِس کا مطلب ہے ''خود بچنا' اپنا تحفظ حاصل کرنا''۔ یعنی حفاظت کی غرض سے کسی چیز کو پکڑ لینا' کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کا مطلب ہوا اپنے تحفظ کے لیے اللہ کی رسّی یعنی قرآنِ حکیم سے چمٹ جانا۔

◆ بلاشبہ ہماری حفاظت کا مؤثر ترین ذریعہ قرآنِ حکیم ہی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسد ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' اور ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ دراصل قرآن ہی سے ہے۔ لہٰذا اُسے مضبوطی سے تھام لو کہ یہی اللہ کی رسّی ہے!''

قرآنِ حکیم کے ذریعہ تحفظ ہونے کا مظہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوا سلامٌ علیہما کو جنت سے نکل جانے اور زمین میں جا کر آباد ہونے کا حکم دیا تو ساتھ ہی فرمایا:

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''پس اگر تمہارے پاس آئے میری طرف سے ہدایت تو جس کسی نے میری ہدایت کی پیروی کی تو نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غم سے دوچار ہوں گے''۔

اِسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلّوا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ))(٦)

''میں تمہارے درمیان ایسی شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک تم اِس سے چمٹے رہے کبھی گمراہ نہ ہو گے' (اور وہ ہے) اللہ کی کتاب (قرآن کریم)''۔

قرآنِ حکیم کے ذریعے ہماری حفاظت کے دو پہلو ہیں:

(i) انفرادی اعتبار سے انسان کے نفس کی باطنی بیماریوں سے حفاظت یعنی تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرآنِ حکیم ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس)

''اے لوگو! تمہارے پاس آ چکی ہے نصیحت تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفاء ہے دل کی بیماریوں کی اور اہل ایمان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے''۔

انسان کے نفس کے اندر جو روگ ہوتے ہیں' جیسے حب جاہ' حب دُنیا' حب مال' ان کے ازالے اور ان کے معالجے کے لیے اس سے بڑی دوا کوئی نہیں۔ نفس کو شیطان کی وسوسہ اندازی کے شر سے بچانے کے لیے تعلیماتِ قرآنی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ قرآنِ حکیم پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ واقعتاً شیطان انسان کا بہت بڑا دشمن اور ایک بڑی طاقت ہے۔ قرآنِ حکیم ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ کس کس طریقے سے وہ ہمارے سامنے جال پھیلاتا ہے' اِس دنیا کی زندگی میں کشش پیدا کرتا ہے اور انسان کے برے اعمال کو اُس کے لیے مزین کر کے دکھاتا ہے۔ پھر شیطان کے حملوں سے بچنے کی تدابیر اور دعائیں بھی قرآن ہی ہمیں سکھاتا ہے۔

(ii) اجتماعی اعتبار سے اُمت کے لیے ذلت و رسوائی سے بچنے اور عزت کے حصول کا ذریعہ قرآنِ حکیم ہے۔ از روئے حدیث نبویؐ:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(٧)

'' اللہ اِس کتاب کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و عروج عطا فرمائے گا اور (اِسے ترک

کر دینے کی وجہ سے) دوسروں کو ذلت سے دوچار فرمائے گا''۔

◆ قرآنِ حکیم سے چمٹنے سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے حسبِ ذیل حقوق ادا کیے جائیں :

۱) قرآنِ حکیم پر قلبی یقین والا ایمان رکھنا۔
۲) قرآنِ حکیم کی پیروی کی نیت سے تلاوت کرنا۔
۳) قرآنِ حکیم کو اپنی صلاحیت کے مطابق سمجھنا۔
۴) قرآنِ حکیم پر عمل کرنا اور اِس کے اجتماعی اَحکام کے نفاذ کے لیے کوشش کرنا۔
۵) قرآنِ حکیم کی تعلیمات دوسروں تک پہنچانا۔

(اس حوالے سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی تصنیف ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا مطالعہ مفید رہے گا)

◆ قرآنِ حکیم سے چمٹنا انسان کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں حکم دیا گیا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ'' —— یعنی اللہ کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ اللہ کے ساتھ چمٹنے کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ کی رسّی یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ چمٹ جاؤ۔

◆ ''جَمِیْعًا'' کے لفظ کے لیے یہاں دونوں امکانات موجود ہیں۔ ''جَمِیْعًا'' حبل اللہ یعنی قرآن کا حال بھی ہو سکتا ہے اور مخاطبین کا بھی۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ پورے قرآن کو تھامو' یعنی قرآن کے ہر حکم پر عمل کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ''سب مل جل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو''۔ اِس سے اب ایک جمعیت وجود میں آ جائے گی۔

◆ آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور آپس میں متفرق نہ ہو' تفرقہ نہ ڈالو''۔ تفرقہ یعنی باہم اختلافات کے نتیجہ میں انتشار سے بچنے کے لیے بھی قرآنِ حکیم ایک بہترین ذریعہ ہے۔ قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے راستہ کی پیروی کرنے سے اختلاف والی باتیں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باہم اختلافات والی باتیں سطحی اور فروعی نوعیت کی ہیں۔ قرآنِ حکیم ہمیں ایسا اعلیٰ مشن اور بلند نصب العین دیتا ہے کہ ہم فروعی اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اختلافات اور تفرقہ کی بنیاد عام طور پر منافقت پر ہوتی ہے۔ جب قرآنِ حکیم کے ذریعہ سے انسان کا منافقانہ رخ ختم ہو جاتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ تفرقے بھی آپ سے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔

◆ اِس کے بعد قرآنِ حکیم کی وجہ سے ختم ہونے والے ایک تفرقہ کا بطورِ نعمت ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو جبکہ تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے' تو اُس نے تمہارے دلوں کے مابین محبت ڈال دی تو تم اُس کی اس نعمت کے سبب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ دراصل ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اسلام سے قبل عربوں کے درمیان معمولی مسائل پر جنگیں چھڑ جاتیں جو طویل عرصہ تک جاری رہتیں۔ مولانا حالی نے اِس کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا!

قرآنِ حکیم نے آ کر دلوں کی کیفیت بدل دی، عرب کے عام انسانوں کو صحابۂ کرام j کے مقام تک بلند کر دیا' اور اب ایک دوسرے کے لیے ایثار کا وہ جذبہ سامنے آیا جس کی تحسین اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں فرمائی:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (الحشر: ۹)

''وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود کتنے ہی تنگ دست ہوں''۔

◆ اِس کے بعد مزید فرمایا: ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ''اور (یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو) جبکہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اُس نے تمہیں اِس سے بچا لیا''۔ یہاں خاص طور پر قبیلہ اَوس اور قبیلہ خزرج کی طرف اشارہ ہے۔ اُن کے مابین طویل عرصہ سے جنگ چلی آ رہی تھی۔ جیسے آج بھی قبائل کے درمیان دشمنی اور خون ریزی کے معاملات نسل در نسل چلتے ہیں' وہاں بھی کشت وخون کا بازار گرم تھا۔ صحابۂ کرامؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم تباہی کے آخری کنارے تک پہنچ چکے تھے مگر اللہ نے تمہیں بچا لیا' دنیا میں مالی و جانی تکالیف اور نقصان سے اور آخرت میں جہنم کی آگ سے۔ آج ہمارے درمیان بھی زبان اور نسل کی بنیاد پر نفرتیں ہیں۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات پر عمل سے ہمارا باہمی انتشار ختم ہو سکتا ہے اور آخرت کی کامیابی بھی نصیب ہو سکتی ہے۔

◆ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ ''اِسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت

حاصل کرو‘‘۔قرآنِ حکیم کا مقصدِ نزول ہدایت ہے‘یعنی تعلیماتِ قرآنی کو سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا۔ اِس دنیا میں اور بھی بہت سی چیزیں ہے جن کو ہم نعمتیں کہتے ہیں‘ لیکن قرآنِ مجید نعمت کہتا ہے‘نعمت ہدایت کو۔ بلاشبہ نعمتِ ہدایت ہی ہر نعمت کی روح ہے۔ ہدایت ہے تو دنیا کی ہر نعمت واقعی نعمت ہے ورنہ روزِ قیامت یہ نعمتیں انسان کے لیے پکڑ کا باعث بن جائیں گی۔ انسان کے پاس مال و دولت بھی ہو‘اولاد بھی ہو‘ جائیداد بھی ہو‘ منصب بھی ہو‘ لیکن اگر ان تمام چیزوں کو استعمال کرنے کی ہدایت اور رہنمائی نہیں ہے تو وہ سب انسان کے لیے ہلاکت ہیں ‘اور اگر انسان کے پاس اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو استعمال کرنے کا ڈھنگ ہو تو وہ سب نعمتیں مفید اور کارآمد ہیں۔مثلاً روپیہ پیسہ اللہ کی نعمت ہے‘ لیکن اِسی صورت میں کہ انسان ہدایت ِ خداوندی کی روشنی میں اُسے جائز ذرائع سے حاصل کرے اور جائز مدات میں صرف کرے۔ا گر ایسا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ جب دریافت فرمائیں گے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ تو انسان کے لیے جوابدہی مشکل ہو جائے گی‘ اور یہی پیسہ انسان کے لیے ہلاکت بن جائے گا۔

☆ آیت ۱۰۴

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ ’’اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائے‘‘ ..... ﴿وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ’’اور نیکی کا حکم دے‘‘ .....﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ’’اور برائی سے روکے‘‘.....﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ’’اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں‘‘۔

◆ اِس آیت میں ہدایت کا تیسرا نکتہ بیان کیا جا رہا ہے۔قرآن کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اہلِ ایمان کی اجتماعیت کو ’’اُمت‘‘ قرار دے کر ایک عملی لائحۂ عمل کی رہنمائی دی جا رہی ہے۔

◆ یہاں ’’اُمت‘‘ کا لفظ قابل غور ہے۔اُمت کے معنی ہیں ہم مقصد لوگوں کا گروہ۔ اُمت کسی نسل‘ زبان یا علاقے کی بنیاد پر نہیں بنتی۔ یہ بنیادیں قومیت کے لیے ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے لیے پورے قرآن میں کہیں لفظ ’’قوم‘‘ نہیں آیا۔سابقہ انبیاء اپنی اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور اُن کی دعوت میں ’’یَا قَوْمِ‘‘ کے الفاظ آتے ہیں۔نبی اکرم ﷺ کی رسالت تمام انسانوں کی طرف ہے‘ لہٰذا قرآنِ حکیم میں خطاب ’’یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ‘‘ اور ’’یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ سے ہوتا ہے۔آپ ﷺ پر ایمان لانے والے ایک قوم نہیں بلکہ ایک اُمت یا حزبُ اللہ ہیں۔اُن کا مقصد ہے ’’شہادت علی الناس‘‘ یعنی لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور برائیوں سے روکنا اور اُن تک اللہ کی تعلیمات کو پہنچا دینے کا حق ادا کر دینا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

’’اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اُمت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول (آخرالزماں ﷺ) تم پر گواہ بنیں‘‘۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آلِ عمران : ۱۱۰)

’’تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے۔تم (لوگوں کو) نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے رہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو‘‘۔

اگر پوری اُمت اِس مقصد سے غافل ہو جائے تو عذابِ شدید سے دوچار ہو سکتی ہے۔حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ، ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ)) (۸)

’’قسم ہے اُس ہستی کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے‘ تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہو گے‘ اور برائی سے روکتے رہو گے ورنہ اندیشہ ہے کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے گا‘ پھر تم اُسے پکارو گے لیکن تمہاری پکار کا جواب نہیں دیا جائے گا‘‘۔

البتہ اگر پوری اُمت اپنے مقصد کو بھول جائے اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری کو نظر انداز کر دے تو کیا پھر سب کے سب سوئے رہیں؟ نہیں! تم میں ہم مقصد لوگوں کا ایک گروہ تو ایسا ضرور ہو جو جاگے‘ منظم ہو اور دوسروں کو جگائے۔ اِس گروہ کو تین کام کرنے ہیں :

(i) دعوت الی الخیر‘یعنی بھلائی کی طرف بلائے۔
(ii) امر بالمعروف‘یعنی نیکی کا حکم دے۔
(iii) نہی عن المنکر‘یعنی برائی سے روکے۔

◆ دعوت الی الخیر میں خیر سے کیا مراد ہے؟ خیر کا لفظ قرآنِ حکیم میں اکثر و بیشتر تین معنی

میں آتا ہے۔ خیر دُنیوی مال واسباب کے لیے بھی آتا ہے‘ جیسے سورۃ العادیات میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ ’’اور یقیناً وہ (انسان) دُنیوی مال واسباب کی محبت میں شدید ہے‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ اِس مقام پر خیر کا یہ مفہوم مراد نہیں ہوسکتا کہ مال و دولت کی طرف بلایا جائے۔ خیر کا دوسرا مفہوم ہے بھلائی‘ جیسے سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۷ میں وارد ہوا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ ’’اور تم جو بھی کوئی کام کرتے ہو بھلائی میں سے اللہ اُسے جانتا ہے‘‘۔ یہ مفہوم یہاں مراد ہوسکتا ہے‘ لیکن آگے لفظ معروف بھی اِسی معنی میں آرہا ہے جس سے بظاہر ایک تکرار سامنے آرہی ہے۔ خیر کا تیسرا مفہوم ہے خود قرآنِ حکیم جو بلاشبہ سب سے بڑی بھلائی ہے۔ سورۃ النحل آیت ۳۰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ﴾ ’’اور جب پوچھا گیا اُن لوگوں سے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل کیا؟ اُنہوں نے کہا کہ ہمارے رب نے خیر نازل کی ہے‘‘۔ یہ مفہوم اِس مقام پر زیادہ مناسب ہے‘ یعنی دعوت الی الخیر سے مراد ہے دعوت اِلی القرآن۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس اجتماعیت کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو قرآنِ حکیم کے حقوق کی ادائیگی کی طرف دعوت دے۔

◆ امر بالمعروف کے حوالے سے نوٹ کیجیے کہ امر کا لفظ عربی میں ترغیب وتشویق‘ مشورہ دینے اور تحکم یعنی حکم جاری کرنے کے لیے آتا ہے۔ معروف کے لغوی معنی ہیں جانا پہچانا کام۔ نیکی کو معروف اِس لیے کہتے ہیں کہ اِس کی پہچان اللہ نے ہمارے اندر الہام کردی ہے۔ ہمارے وجود میں روحِ ربانی ہے جسے نہ صرف نیکی کی معرفت ہے بلکہ اِس کا میلان بھی نیکی کی طرف ہے۔ شرعی اعتبار سے وہ باتیں جن کا اللہ اور نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا وہ معروف ہیں۔ مسلمانوں کی قائم ہونے والی اجتماعیت کی دوسری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو نیکی کی ترغیب دے‘ تلقین کرے اور جہاں ممکن ہو اِس کا حکم دے۔

◆ نہی عن المنکر کے ضمن میں نوٹ کیجیے کہ منکر کے لغوی معنی ہیں ناپسندیدہ کام۔ برائی کو منکر اِس لیے کہتے ہیں کہ فطرتِ انسانی اِسے ناپسند کرتی ہے۔ شرعی اعتبار سے وہ باتیں جن سے اللہ اور نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا منکر ہیں۔ نہی عن المنکر یعنی برائیوں سے روکنا مسلمانوں کی اجتماعیت کی تیسری ذمہ داری ہے۔

◆ ’’دعوت الی الخیر‘‘ اور ’’امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘‘ تبلیغ کے دو مختلف اسلوب ظاہر کرتے ہیں۔ دعوت کی اصل روح سوز‘ ہمدردی‘ نصح وخیر خواہی اور اپیل کا انداز ہے۔ اِس میں خوشامد ہے۔ لوگوں کی منت سماجت کرنا کہ خدا کے لیے اپنی غلط روش سے باز آجاؤ اور قرآن کی طرف لوٹ آؤ۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں وعظ ونصیحت کا نہیں بلکہ تنفیذ کا انداز ہے۔ اِس میں تحکم بھی ہے اور حسبِ موقع قوت کا استعمال بھی ہے۔ ابتدا میں دعوت کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جاتی ہے۔ البتہ جو لوگ ابوجہل کی طرح پیار کی زبان سے اثر قبول نہ کریں تو پھر قوت کے ذریعے اُنہیں سیدھا کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے کو ظلم وجور سے پاک کیا جاسکے۔

◆ ایک تصور یہ ہے کہ ہمیں صرف امر بالمعروف کا کام کرنا چاہیے‘ اِس سے منکرات کا سدباب خود بخود ہوجائے گا۔ یہ تصور درست نہیں‘ کیونکہ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاذ اللہ‘ نہی عن المنکر کے الفاظ صرف زورِ بیان کے لیے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں کوئی لفظ اضافی یا محض زورِ بیان کے لیے نہیں۔ قرآنِ حکیم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک وحدت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ انسان کی تربیت واصلاح کے لیے دونوں امور ضروری ہیں۔ آیت زیرِ درس کے علاوہ حسبِ ذیل نو مقامات پر یہ دونوں اُمور بالکل ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں:

(۱) سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۱۰ (۲) سورۂ آل عمران‘ آیات ۱۱۴
(۳) سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۵۷ (۴) سورۃ التوبۃ‘ آیت ۶۷
(۵) سورۃ التوبۃ‘ آیت ۷۱ (۶) سورۃ التوبۃ‘ آیت ۱۱۲
(۷) سورۃ النحل‘ آیت ۹۰ (۸) سورۃ الحج‘ آیت ۴۱
(۹) سورۂ لقمان‘ آیت ۱۷

گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں‘ ان کو جدا کردینا قرآن کے بنیادی تصورات کی نفی قرار پائے گا۔ اِس حوالے سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب ’’اُمتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل‘‘ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

◆ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں نہی عن المنکر کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ یہ حقیقت مندرجہ ذیل آیات اور احادیث سے واضح ہوتی ہے:

﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ (المائدۃ)

''کیوں نہیں روکتے اُنہیں اُن کے صوفیا اور علماء گناہ کی باتوں سے اور حرام کھانے سے؟ بہت ہی بری کاریگری ہے جو وہ کر رہے ہیں''۔

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾ (المائدۃ)

''لعنت کی گئی اُن لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کی زبان سے۔ اِس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے گزرتے تھے۔ وہ روکتے نہیں تھے اُس برائی سے جو کہ لوگ کر رہے تھے۔ یقیناً برا فعل ہے جو وہ کر رہے تھے''۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں :

((مَنْ رَّاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (۹)

''جو کوئی بھی تم میں سے کسی برائی کو دیکھے اُس کا فرض ہے کہ اُس کو اپنے ہاتھ سے بدلے۔ پھر اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان کے ساتھ اُس سے روکے، اگر اِس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

یعنی اصلاً تو مطلوب یہ ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکا جائے۔ البتہ اگر استطاعت نہ ہو، یعنی داخلی اعتبار سے آدمی کمزور یا بزدل ہے یا پھر خارجی اعتبار سے حالات واقعی انتہائی خوفناک ہوں اور جان کو خطرہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ زبان سے برائی کو روکا جائے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر دل میں برائی سے نفرت کی جائے۔ البتہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اِس حدیث سے واضح ہو گیا کہ نہی عن المنکر ہر فرد کے ایمان کا تقاضا ہے۔ البتہ مراتبِ ایمانی کے ساتھ علی الترتیب نہی عن المنکر کے بھی تین مراتب ہو جائیں گے۔

ایک لرزا دینے والی حدیث ہے :

((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا، فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ، فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ)) (۱۰)

''اللہ تعالیٰ نے حکم دیا جبرائیلؑ کو کہ فلاں شہر کو مع اُس کے باشندوں کے اُلٹ دو۔ جبرائیلؑ نے عرض کی: اے پروردگار! اُن لوگوں میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے دوران (یعنی ایک لمحہ) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس شہر کو دیگر باشندوں کے ساتھ اُس پر بھی الٹ دو، کیوں کہ (شہر والوں کے کرتوتوں پر) میری خاطر اُس کا چہرہ ایک گھڑی بھی متغیر نہیں ہوا''۔

ایسا شخص بے حمیت ہے جو اللہ کی نافرمانیاں دیکھے لیکن اُسے کوئی دکھ نہ ہو اور اُس کا خون تک نہ کھولے۔ کمزور سے کمزور انسان کو بھی اگر ماں کی گالی دی جائے، اور چاہے وہ اپنی کمزوری کے سبب گالی دینے والے پر اپنا ہاتھ نہ اٹھا سکے، مگر وہ غصے سے کانپے گا اور اپنی جگہ لرز کر رہ جائے گا۔ اِسی طرح اللہ کی نافرمانی کو دیکھ کر بھی انسان کا ردِّعمل کم از کم ایسے ہی ہونا چاہیے۔ ورنہ ایسا انسان بے حمیت ہی نہیں بے غیرت قرار پائے گا۔ اللہ ہمیں ایسی بے حسی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

ایک اور حدیثِ مبارکہ ہے :

مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ ، فَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَ لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (۱۱)

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبیؑ نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کے کچھ حواری اور صحابی ہوتے تھے جو اُس نبیؑ کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اُس کے احکامات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم ہی نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو کوئی ان لوگوں سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مؤمن شمار ہوگا، اور جو کوئی اُن سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہوگا، اور جو کوئی اُن سے دل سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہوگا، اور اِس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں''۔

يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ ''جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا اُنہیں حکم نہیں ہوا تھا''۔ حدیثِ مبارکہ کے اِس حصہ میں قول و فعل کا تضاد' عمل میں فسق و فجور اور بدعات تینوں چیزیں آ گئیں۔ گویا انتہائی جامع الفاظ میں ہمارے بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے کی تصویر آ گئی جس کی اصلاح کا طریقِ کار اِس درس کا عنوان ہے۔

◆ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مشورہ اور تحکم دونوں پہلو شامل ہوتے ہیں۔ غالب استعمال کے اعتبار سے زیادہ رجحان تحکم کا ہے جس کی وجہ سے ایک مغالطہ یہ پیدا ہوا کہ یہ صرف حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں کہ جب اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُسی کی ذمہ داری ہے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الحج: ٤١)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے''۔

اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اِس کی ذمہ داری ہے' لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اب یہ ذمہ داری ایک ایک فرد پر منتقل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شہریوں کے جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔! فرض کیجئے کہ ملک میں انارکی ہو جائے' نظام درہم برہم ہو جائے' یا پولیس انتہائی کرپٹ ہو چکی ہو اور پہرے دار خود ڈاکو بن جائیں تو اِن حالات میں شہری پاؤں پھیلا کر اطمینان سے سو نہیں جائیں گے بلکہ اپنی حفاظت کا خود انتظام کریں گے۔ یہ بات بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ نہی عن المنکر میں دل' زبان اور ہاتھ سے برائی کو روکنے کے درجات شامل ہیں۔ لہٰذا اِس ذمہ داری کو صرف حکومت پر ڈال دینا ایک طرح کی فراریت ہے۔

◆ آیت کے آخر میں بشارت دی گئی: ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ''اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔ یہ کلامِ حصر ہے۔ اگر کہا جاتا ''اُولٰٓئِکَ مُفْلِحُوْنَ'' تو اِس کا مطلب ہوتا وہ فلاح پانے والے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا مفہوم ہے یہی فلاح پانے والے ہیں۔ گویا محض ذاتی نیکی اور پارسائی سے فلاح حاصل نہیں ہوگی بلکہ اِس کے لیے دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ روزِ قیامت وہی لوگ کامیاب ہوں گے جو مذکورہ بالا امور کی انجام دہی کے لیے قائم ہونے والی اجتماعیت میں شامل ہوں اور فعال طور پر مذکورہ امور انجام دے رہے ہوں۔

◆ بعض مخلص لوگ دین کی خدمت کے جذبہ سے کسی اجتماعیت میں شامل تو ہو جاتے ہیں لیکن کسی مسلک' فرقہ واریت یا عوام میں پذیرائی حاصل کرنے کے لیے جزوی حق کی دعوت دینے میں مشغول رہتے ہیں۔ اِس آیت میں فلاح کی نوید صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو اجتماعی طور پر دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ نہی عن المنکر کی اعلیٰ ترین صورت نہی عن المنکر بالید یعنی قتال فی سبیل اللہ ہے' جس کا ذکر سورۃ التوبۃ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ میں آ رہا ہے۔

سورۃ التوبۃ' آیات ۱۱۱-۱۱۲

☆ آیت ۱۱۱

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''بے شک اللہ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لیے ہیں جنت کے بدلہ میں'' ..... ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں'' ..... ﴿فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ ''پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں'' ..... ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ﴾ ''یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہے تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں'' ..... ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو بھی کون سکتا ہے؟'' ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ ..... ''پس خوشیاں مناؤ اپنے اُس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے'' ..... ﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ ''اور وہی ہے سب سے بڑی کامیابی''۔

◆ اِس آیت میں ایک سودے کا ذکر ہے۔ سودا کہتے ہیں لین دین کرنا' کسی سے کچھ لے کر اسے اُس کے عوض کوئی چیز دینا۔ اِس سودے میں خریدار اللہ ہے' وہ مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید رہا ہے۔ غور کیجیے کہ ہماری حیثیت کیا ہے؟ نہ ہمارا مال اپنا ہے اور نہ ہماری جان اپنی ہے' سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ وہ جب چاہے ہماری زندگی کا چراغ

گل کر دے اور جب چاہے ہمارا مال چھین لے۔ اِس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمارے امتحان کی خاطر اپنی عطا کردہ نعمتیں ہم سے جنت کے عوض خریدنے کا سودا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے مال اور اپنی جانیں اُس کی رضا کی خاطر لگا دیں' کھپا دیں۔

◆ جو شخص بھی کلمہ پڑھ کر ایمان لانے کا اعلان کرتا ہے وہ گویا اللہ کے ساتھ ایک عہد میں بندھ جاتا ہے۔ اب اُس کی جان اور اُس کا مال اُس کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اب اگر بالفرض وہ مال اور جان اللہ کی مرضی کے خلاف کسی کام میں لگاتا ہے تو وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت کا جرم کرتا ہے۔ اِسی لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَـهٗ وَ لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَـهٗ)) (۱۲)

''جو امانت کی پاسداری نہیں کرتا اُس کا ایمان ہی نہیں' اور جو وعدہ پورا نہیں کرتا اُس کا کوئی دین نہیں''۔

انسان کے اِس امتحان کی علامہ اقبال نے کیا خوب ترجمانی کی ہے کہ : ؎

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

''جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ اِس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ کے تقاضے کیا ہیں''۔

◆ اِس آیت میں واضح کیا گیا کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو نبھاتے ہیں وہ ایسے سرفروش ہیں کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کے دشمنوں کی جانیں لیتے ہیں اور خود بھی جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔ البتہ اِس سے مراد یہ نہیں کہ کلمہ پڑھتے ہی ہتھیار اٹھا لیے جائیں۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ راہ اختیار کی جائے جو انسان کو قتال فی سبیل اللہ کے اعلیٰ ترین عمل کی طرف لے جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ظہورِ نبوت کے بعد دعوت کے ذریعے ایک جماعت تیار کی۔ جماعت میں شامل ساتھیوں کی ایمان و یقین، سیرت و کردار، جذبۂ ایثار و قربانی اور نظم کی پابندی کے اعتبار سے تربیت کی۔ مخاطبین پر تبلیغ اور پاکیزہ کردار کے ذریعے حجت تمام کی۔ اِس پورے عمل میں پندرہ برس لگ گئے۔ اِس کے بعد بدر کا مرحلہ آیا جس میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے قتال فی سبیل اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اللہ سے عہد کو نبھانے کے لیے ہم پر اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی لازم ہے۔

◆ اللہ کے ساتھ سودا نقد نہیں بلکہ ادھار کا ہے۔ مومنوں کو جان اور مال اِس دنیا میں کھپانے ہیں لیکن اُنہیں جنت کا بدلہ آخرت میں دیا جائے گا۔ ادھار سودے میں کھٹکا ہوتا ہے کہ پتا نہیں بدلہ ملے گا یا نہیں؟ ہم یہاں قربانیاں دے رہے ہیں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں' لیکن آخرت میں ہمیں کچھ ملے گا بھی یا نہیں؟ اللہ نے اِس کھٹکے کا ازالہ بڑے تاکیدی انداز میں کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہے' اور اللہ نے اِس کا اعلان تورات میں کیا' انجیل میں کیا اور اب قرآن میں بھی کر رہا ہے۔ اللہ سے بڑھ کر وعدہ وفا کرنے والا کون ہے؟ گویا اللہ خود اپنے عہد کا ضامن بن رہا ہے۔ اب اِس عہد کے پورا ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔

◆ آیت کے آخر میں سودے کے لیے لفظ ''بیع'' آیا ہے۔ اِسی سے لفظ بیعت بھی بنتا ہے۔ کسی سے سودا کرنے کے بعد جو ہاتھ ملایا جاتا ہے یہی اصل میں بیعت ہے۔ بعض اوقات معاہدہ کسی ادارے کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اُس کے لیے معاملات ادارے کے نمائندہ سے طے کیے جاتے ہیں۔ معاہدے پر دستخط کے بعد بیعت یعنی hand shake نمائندے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح بندۂ مؤمن کا سودا تو اللہ کے ساتھ ہے لیکن یہ اللہ کے نمائندے یعنی اللہ کے رسول ﷺ کی وساطت سے ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾

''بے شک اے نبیؐ جو لوگ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔

حق و باطل کا معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد باطل کے خلاف منظم جدوجہد کے لیے اب بیعت کسی ایسے اُمتی کے ہاتھ پر ہوگی جس کے خلوص و اخلاص' دیانت اور قیادت کی صلاحیت پر اعتماد ہو' لیکن یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ اصل عہد اُس اُمتی سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے۔ باطل کے خلاف کامیابی کے لیے منظم جدوجہد ضروری ہے۔ اِس کے لیے تنظیم کے قیام کی منصوص اور مسنون اساس بیعت ہی ہے۔

◆ آخر میں فرمایا گیا کہ خوشیاں مناؤ اُس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ یہ بات مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ ایک انسان کسی وقت جذبات میں کوئی بڑا فیصلہ کر بیٹھتا

ہے۔ وقتی طور پر ایک تحریک پیدا ہوئی تو اپنا کیریئر تج دینے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کے ساتھ جڑ گئے۔ لیکن محسوس ہو رہا ہے کہ طبیعت بجھی بجھی سی ہے۔ بجائے اِس کے کہ طبیعت میں بشاشت ہو، وہ شخص اندر ہی اندر سے محسوس کر رہا ہے کہ یہ میں کتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھا ہوں۔ معلوم نہیں میں نے صحیح کیا ہے یا غلط کیا ہے؟ مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا بھی چاہئے تھا کہ نہیں؟ اگر اِس قسم کی کیفیت کا انسان کے اندر کوئی مستقل سایہ پڑ رہا ہو تو یہ ایک بہت خوف ناک مرض کی علامت ہے۔ پھر اِس ضمن میں اُس کے اندر جو ایک کشاکش ہوتی ہے وہ جماعتی زندگی کے اندر فتنہ انگیزی شروع کرتی ہے۔ ایسا شخص طرح طرح سے اپنے اِس عدمِ اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں جذبات میں ایک غلط فیصلہ کر بیٹھا ہوں، لیکن اِس کا علی الاعلان اعتراف آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر اُس کے اپنے اندر ایک بہت بڑی ہلچل ہوتی ہے، اور یہی ہلچل پھر جماعتی زندگی کے اندر طرح طرح کی خرابیوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آیت کے اِن الفاظ مبارکہ پر غور کیجئے کہ تم خوشیاں مناؤ اپنی اِس بیع پر جو تم نے کی ہے! یہ سودا کرنے کے بعد غمگین کیوں ہو گئے؟ کیا تمہیں اللہ کی بات پر یقین نہیں یا تمہارا ''ویلیوسٹرکچر'' کا معاملہ ابھی واقعتاً پختہ نہیں ہوا تھا اور یہ بات تم نے شعوری طور پر طے نہیں کی تھی کہ ہم دنیا دے کر آخرت قبول کر رہے ہیں؟ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝١٧﴾ ''تم اِس دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے''۔

اِس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان عارضی زندگی میں اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی خوشنودی کے لیے لگا دے، کھپا دے، یعنی invest کر دے، پھر ابدی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کی جنت کی لذتیں حاصل کرے۔ اِس سودے پر چہرے دمکنے چاہئیں۔ یہ وہ سودا ہے کہ جس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ جسم و جان لگانے کی وہ قیمت وصول کی ہے جس سے بڑی قیمت کوئی نہیں۔ بلاشبہ یہی تو ہے سب سے بڑی کامیابی!

☆ آیت ۱۱۲

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ ''توبہ کرنے والے''..... ﴿الْعٰبِدُوْنَ﴾ ''بندگی کرنے والے''..... ﴿الْحٰمِدُوْنَ﴾ ''حمد و ثنا اور شکر کرنے والے''..... ﴿السَّآئِحُوْنَ﴾ ''دُنیا کی لذتوں سے کنارہ کشی کرنے والے''..... ﴿الرّٰكِعُوْنَ﴾ ''رکوع کرنے والے''..... ﴿السّٰجِدُوْنَ﴾ ''سجدہ کرنے والے''..... ﴿اٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''نیکی کا حکم دینے والے''..... ﴿وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور برائی سے روکنے والے''..... ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنیوالے''..... ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١١٢﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بشارت دے دیجئے ایسے مومنوں کو''۔

◆ اِس آیت میں اُن مؤمنوں کے نو (۹) اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اوصاف مؤمنین کے اعمال نہیں بلکہ طرزِ عمل (attitude) کو ظاہر کرتے ہیں۔ اِن میں سے پہلے چھ اوصاف کا تعلق فرائض دینی کی پہلی منزل یعنی ذاتی زندگی میں اللہ کی بندگی سے ہے۔ اِس کے بعد دو اوصاف فرائض دینی کی دوسری منزل یعنی دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینے سے متعلق ہیں۔ آخری وصف فرائضِ دینی کی تیسری منزل یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد کو نمایاں کر رہا ہے۔

◆ پہلا وصف بیان ہوا ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ یعنی توبہ کرنے والے۔ مومنین کا مستقل طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہتے ہیں، اور جب بھی احساس ہوتا ہے کہ گناہ ہو گیا ہے تو فوراً اللہ کی طرف پلٹتے ہیں اور اُس سے بخشش مانگتے ہیں۔

◆ دوسرا وصف ہے ﴿الْعٰبِدُوْنَ﴾ یعنی وہ زندگی کے جملہ معاملات میں ذوق و شوق کے ساتھ اللہ کی بندگی کی روش اختیار کرتے ہیں۔

◆ تیسرا وصف ہے ﴿الْحٰمِدُوْنَ﴾ یعنی وہ دل سے، زبان سے اور ہر نعمت کا اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے طرزِ عمل سے اللہ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں۔ اِس وصف کا تعلق انسان کے شعور اور فکر کے ساتھ ہے۔ جتنی اللہ کی معرفت بڑھے گی اتنے ہی اللہ کے لیے شکر کے جذبات بھی بڑھتے چلے جائیں گے۔

◆ چوتھا وصف ﴿السَّآئِحُوْنَ﴾ ہے کہ وہ سیاحت کرنے والے (لذاتِ دنیوی سے کنارہ کش رہنے والے) ہوتے ہیں۔ جس طرح سیاحت یعنی سفر کے دوران انسان اپنے گھر کا آرام چھوڑ دیتا ہے اِسی طرح معنوی اعتبار سے سیاحت یہ ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر عیش و آرام اور لذاتِ دُنیوی کو چھوڑ دینا اور قناعت اختیار کرنا۔ عیسائیت میں اِسی نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔ اسلام میں سیاحت روزہ اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ روزہ میں نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے اور نہ تعلق زن و شو ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ میں بھی انسان کو گھر کے آرام اور گھر کی

سہولتوں وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلنا پڑتا ہے۔ اللہ کے مؤمن بندے اللہ کی خاطر ہر وقت آرام و آسائش ترک کر کے اُس کی راہ میں مال و جان لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ نوٹ کیجئے دُنیوی معاملات میں تو گھر والے کبھی آڑے نہیں آتے۔ جہاں بہتر روزگار مل رہا ہو وہاں گھر والے خود بھیجتے ہیں اور سامان باندھنے میں بیوی بچے سب لگ جاتے ہیں۔ البتہ دین کے معاملے میں کہتے ہیں پاگل ہو گئے ہو' دماغ خراب ہو گیا ہے؟ گھر بار چھوڑ رہے ہو؟ بیٹھے رہو! اگر معاملہ یہ ہو کہ دنیا کے لیے تو بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں یہاں سے وہاں نقل مکانی کرتے پھریں' لیکن دین کے معاملے میں یہ سمجھیں کہ یہ کیسے مناسب ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے کہ وہ جب ہمیں طلب کرے' ہم حاضر ہو جائیں! یہ چیز عکس ڈال رہی ہے انسان کے value structure پر کہ اُس کے ہاں کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ یہ طے کر لیا جائے کہ ہماری ترجیح اللہ اور اُس کے دین کے ساتھ ہے' زمین کے ساتھ نہیں۔ سورۃ العنکبوت میں یہی بات فرمائی گئی ہے:

﴿ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ ﴾

''اے میرے اہل ایمان بندو! میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی کرو''۔

یعنی دین کے تقاضے جہاں اور جس طور سے بہتر سے بہتر ادا ہوں وہاں چلے جاؤ۔ حرکت میں رہو! زمین کے اندر کہیں جڑیں نہ اُتارلو کہ نہ زمین ہلے نہ ہم ہلیں۔ انسان سوچتا ہے کہ میں نے یہاں محنت کی ہوئی ہے' یہاں پریکٹس جمائی ہوئی ہے' میری بیس سال کی مشقت اِس زمین میں گڑی ہوئی ہے' یہاں سے ہل جاؤں تو مجھے کہیں جا کر ازسرنو پریکٹس جمانی ہوگی۔ یہاں میری شہرت ہے اور میرے تعلقات ہیں۔ تو فرمایا کہ مؤمن بندے اللہ کی راہ میں سیاحت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اُن کا نظریہ بقول اقبال یہ ہوتا ہے ع ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

◆ پانچواں وصف ہے ﴿الرّٰکِعُوۡنَ﴾ یعنی رکوع کرنے والے' اور چھٹا وصف ہے ﴿السّٰجِدُوۡنَ﴾ یعنی سجدہ کرنے والے۔ یہ دو اوصاف اللہ کے محبوب بندوں کی عاجزی و انکساری کو بھی ظاہر کر رہے ہیں اور نماز میں شغف سے اُن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کو بھی' جیسے سورۃ الفتح کی آخری آیت میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿تَرٰىهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ۫ سِيۡمَاهُمۡ فِىۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ﴾

''تم اُنہیں دیکھتے ہو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے' وہ اللہ کا فضل اور اُس کی رضا چاہتے ہیں۔ اُن کی نشانی ہے اُن کے چہروں میں سجدوں کے اثرات''۔

◆ ساتواں وصف ہے ﴿الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ﴾ یعنی نیکی کا حکم دینے والے' اور آٹھواں وصف ہے: ﴿النَّاهُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ﴾ یعنی برائی سے روکنے والے۔ برائی سے روکنے کی سب سے اونچی شکل ہے اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنا۔ اِسی کا ذکر ہوا نویں وصف کے طور پر' یعنی ﴿الۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ﴾ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ ایک ہے خود حدود اللہ پر قائم رہنا۔ اِس کا حکم تو پہلے آ چکا ہے ''الۡعٰبِدُوۡنَ'' کے وصف میں۔ یہاں اِس کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ مؤمن بندے اللہ کی حدود کے پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُن کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ:

ترے عشق کی کرامت یہ نہیں تو اور کیا ہے
مرے پاس سے نہ گزرا کبھی بے ادب زمانہ

اگر کسی محفل میں شعائر اللہ کا مذاق اڑایا جا رہا ہو تو وہ وہاں بھی احتجاج کرتے ہیں' اور اگر اجتماعی سطح پر اللہ تعالیٰ کی حدود کا مذاق اڑایا جا رہا ہو' یا اُنہیں نافذ نہ کیا جا رہا ہو' یا اُنہیں پامال کیا جا رہا ہو تو اُن کی غیرت جوش میں آ جاتی ہے۔ وہ کمر کس کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہیں توڑنے دیں گے۔ ہم اللہ کے سپاہی ہیں اور اُس کی حدود کے محافظ ہیں۔ ہمارے جیتے جی اللہ کی حدود پامال نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ایسا کرنا کسی فردِ واحد کے لیے بغیر کسی تیاری کے ممکن نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کا ایک بندہ کھڑا ہو جائے اور اپنی جان دے دے' لیکن اس طرزِ عمل سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ سنتِ نبوی ﷺ ہے کہ ابتدا میں اللہ کی حدود کی پامالی کو بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے' لیکن اُس کے خلاف منظّم اور تربیت یافتہ جماعت کی فراہمی کے ذریعے تیاری کی جائے۔ جب یہ تیاری ہو جائے تو حدود اللہ کی حفاظت کے لیے فیصلہ کن اقدام کیا جائے۔ گویا دور رس منصوبہ بندی (long term planning) کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حدود کی حفاظت کا دیرپا بندوبست کیا جائے۔ ایک ایسی منظّم جماعت فراہم ہو کہ وہ نہ صرف حدود اللہ کو قائم کرے بلکہ اُن کی حفاظت کے لیے جانیں دینے کو تیار

ہو۔ایسے ہی سرفروشوں کے لیے آیت کے آخر میں نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور مؤمنوں کو خوشخبری دے دیجئے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس آیتِ مبارکہ میں بیان شدہ اوصاف کا مصداق بنا دے۔ہم بھی اللہ تعالیٰ کی حدود کے وہ محافظ بن جائیں جن کے لیے یہاں پر خوشخبری کی نوید سنائی گئی ہے۔آمین!

◆ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ ''اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ'' کی کامل مثال تھے۔اگر آپ ﷺ چاہتے تو مکی دور میں بھی حرمِ کعبہ میں نصب کیے ہوئے بتوں کو توڑ سکتے تھے۔لیکن آپ ﷺ نے بھرپور تیاری کے بعد یہ کام کیا' اور اس طرح کیا کہ اب تا قیامِ قیامت حدودِ حرم میں بت نصب نہیں ہو سکتے۔آج ہم ویسے تو مسلمانوں کے معاشرے میں جی رہے ہیں' لیکن یہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ ہے جہاں اللہ کی حدود کا نفاذ تو کجا اُن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔اِن حدود کے نفاذ اور پھر اُن کی حفاظت کے لیے ہمیں نبی اکرم ﷺ کے طریقہ سے ہی رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔

دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کے لیے طریق کار

دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب اُسی طریق کار سے آئے گا جس طریق کار سے اِسے محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا۔امام مالکؒ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول مروی ہے:

'' لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ''(۱۳)

''اس اُمت (مسلمہ) کے آخری حصے کی اصلاح اُسی طریق پر ہوگی جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی ہے''۔

نبی اکرم ﷺ کا طریق انقلاب

نبی اکرم ﷺ نے جو عظیم الشان انقلاب برپا فرمایا' اِس کی تکمیل چھ مراحل سے گزر کر ہوئی:

(۱) پہلا مرحلہ دعوت کا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ حکیم کے ذریعے لوگوں کو دعوت دی کہ نہ صرف اللہ ہی کو معبود تسلیم کریں بلکہ ایسے نظام کے قیام کے لیے مال اور جان سے جہاد کریں جس میں ہر سطح پر اللہ ہی کی اطاعت جاری وساری ہو۔

(۲) دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔نبی اکرم ﷺ نے بیعتِ سمع وطاعت کے مضبوط نظم کے ذریعے دعوت قبول کرنے والوں کو منظّم کیا۔

(۳) تیسرا مرحلہ تربیت اور تزکیہ کا ہے۔آپ ﷺ نے قرآنِ حکیم کی آیات سنا سنا کر ساتھیوں کے دل سے دنیا کی محبت نکالی، اُن میں اللہ کی محبت اور آخرت کی کامیابی کی فکر پیدا کی' نظم کی پابندی کا خوگر بنایا' شریعت پر عمل کا شوق اور اُس کے نفاذ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

(۴) چوتھا مرحلہ صبر محض کا ہے۔آپ ﷺ نے مناسب قوت کی فراہمی تک ساتھیوں کو زبانی اور جسمانی ایذاؤں کو برداشت کرنے اور جوابی کارروائی نہ کرنے لیکن اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تلقین فرمائی۔

(۵) پانچواں مرحلہ اقدام کا ہے۔مناسب تربیت یافتہ افرادی قوت کی فراہمی کے بعد آپ ﷺ نے نظامِ باطل کی دکھتی رگ کو چھیڑا' یعنی قریش کے تجارتی راستوں پر پہرے بٹھا کر اُن کی معاشی ناکہ بندی کی۔وادیٔ نخلہ میں ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا اور اُس کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے قریش نکل کھڑے ہوئے۔

(۶) چھٹا مرحلہ مسلح تصادم کا ہے۔اقدام کے بعد قریش پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو کچلنے کے لیے سن ۲ ہجری میں بدر کے میدان میں آئے اور مسلح تصادم کے مرحلہ کا آغاز ہوگیا۔یہ مرحلہ سن ۸ ہجری یعنی فتح مکہ تک جاری رہا۔فتح مکہ سے اسلامی انقلاب کی تکمیل ہوئی۔

دورِ حاضر میں آخری اقدام

◆ دورِ حاضر میں آخری اقدام کے حوالے سے کچھ مشکلات درپیش ہیں۔نبی کریم ﷺ نے جس دائرۂ کار میں انقلاب کی تکمیل فرمائی' وہاں ایک منظّم ریاست قائم نہ تھی۔ہمیں اِس وقت ایک ایسے معاشرے میں کام کرنا ہے جہاں ایک ریاست منظّم اور مؤثر طاقت کے ساتھ کارفرما ہے' اور وہ نہ صرف اجتماعی بلکہ بعض اعتبارات سے انفرادی معاملاتِ زندگی پر بھی حاوی ہے۔پھر ریاست میں برسرِ اقتدار طبقہ کے پاس اپنے قائم کردہ نظام کے تحفظ کے لیے ہر طرح کے اسباب و وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہمہ وقت اور تربیت یافتہ افواج موجود ہیں۔دوسری طرف عوام بالکل نہتے ہیں۔اِس وجہ سے حکومت کے خلاف کسی مسلح تصادم میں کامیابی کا امکان محال نظر آتا ہے۔

◆ مسلح تصادم کے حوالے سے دوسری مشکل یہ ہے کہ دورِ نبوی ﷺ میں ایک طرف

مسلمان اور دوسری طرف کافر تھے۔ جو آپ ﷺ پر ایمان لائے وہ مسلمان تھے اور جو ایمان نہیں لائے وہ کافر تھے۔ لہٰذا وہاں بالکل دوٹوک مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ تھی۔ یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ یہاں ایک بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ ہے۔ فقہی اور قانونی اعتبار سے یہاں لوگ مسلمان ہیں' خواہ کوئی فاسق ہے یا فاجر' اور مسلمان کے کچھ حقوق ہیں۔ مقابلہ باطل نظام کے محافظ کلمہ گو مسلمانوں سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں تمام مسلمانوں کی جان' مال اور آبرو کو محترم قرار دیا۔ کسی مسلمان کے مقابلے میں ہتھیار اٹھانے کے حوالے سے آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱۴)

''جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ کلمہ گو مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے فقہاءِ احناف نے دو شرائط بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ حکمران کھلم کھلا کفر کا نفاذ کر رہے ہوں' اور دوسری یہ کہ مناسب اسباب اِس حد تک فراہم کر لیے جائیں کہ فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ موجودہ دور میں اسباب یعنی ہتھیاروں اور عسکری تربیت کے اعتبار سے حکومت اور عوام میں بہت زیادہ عدم توازن ہے اور حکومت کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں فتح کا امکان محسوس نہیں ہوتا۔ گوریلا جنگ کے ذریعے حکومت کو نقصان تو پہنچایا جا سکتا ہے لیکن اقتدار حاصل کر کے دین قائم کر دینا ممکن نہیں۔

◆ مذکورہ بالا دو مشکلات کے پیش نظر آخری اقدام کے لیے ہمیں غور و فکر کر کے کوئی اور عنوان اور طریقہ تلاش کرنا ہوگا۔ اب یہ طریقہ بھی ہمیں کہیں باہر سے نہیں تلاش کرنا۔ یہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآنِ حکیم اور سنت رسول ﷺ میں موجود ہے۔ یہ ہے درحقیقت فریضہ ''نہی عن المنکر'' جسے قرآن و حدیث میں بہت نمایاں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ اِس درس میں بیان کی جا چکی ہیں۔

اِن احادیثِ مبارکہ میں معاشرے کی اصلاح کے لیے واضح لائحۂ عمل ہمارے سامنے آ گیا ہے کہ طاقت موجود نہیں ہے تو طاقت حاصل کرو! جیسے ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال: ۶۰) ''اور اُن کے مقابلے کے لیے اپنی امکانی حد تک تیاری کرو''۔ آج کے دَور کی اصل طاقت جماعت ہے' لہٰذا جماعت فراہم کرو! جب ایک منظّم جماعت وجود میں آ جائے تو پھر عوامی دباؤ کے ذریعے حکومت کو اسلامی اقدار کے نفاذ پر مجبور کرو۔ یہ احادیث واضح کر رہی ہیں کہ نہی عن المنکر کے تین مراتب ہیں۔ اِن میں سب سے اونچا مرتبہ نہی عن المنکر بالید ہے۔ آیئے سمجھیں کہ موجودہ دور میں نہی عن المنکر بالید کی صورت کیا ہوگی۔

◆ نوٹ کیجئے کہ زمانے نے جہاں مسلح اقدام کو بہت ہی مشکل بنا دیا ہے وہاں زمانے نے ایک متبادل طریقہ بھی پیدا کیا ہے۔ یہ اُس سیاسی ارتقاء (political evolution) کی وجہ سے ہوا جس کا اکثر و بیشتر لوگوں کو شعور نہیں۔ سیاسی اداروں کے ارتقاء سے آج یہ بات واضح ہوئی ہے کہ حکومت اور شے ہے جبکہ ریاست اور شے۔ جیسے موٹر' ریل' ہوائی جہاز مادّی ایجادات ہیں' ویسے ہی یہ عمرانی ایجادات ہیں۔ مادّی ایجادات کا تو ہم بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں' لیکن اِس عمرانی ایجاد کا فہم و شعور' خاص طور پر ہمارے رجالِ دین کے طبقے میں موجود نہیں ہے۔ اُنہوں نے جدید پولیٹیکل سائنس کا مطالعہ نہیں کیا۔

جدید پولیٹیکل سائنس کی رُو آج کے دَور میں حکومت تو پہلے کے مقابلے میں ایک تہائی رہ گئی ہے' اصل شے اب ریاست ہے۔ شہری کی وفاداری ریاست سے ہے' حکومت سے نہیں۔ حکومت تو اب ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) یعنی مقنّنہ (Legislature)' عدلیہ (Judiciary) اور انتظامیہ (executive) میں سے ایک ہے۔ اداروں کے اِس تعین کا آغاز دورِ خلافتِ راشدہ ہی میں ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور ہی میں مجلس شوریٰ وجود میں آ چکی تھی اور علیحدہ سے قاضی کا تقرر ہو چکا تھا۔ یورپ نے مسلمانوں سے یہ رہنمائی لی اور بعد میں اِسے مزید واضح کر دیا۔

جدید سیاسی نظام میں حکومت کے پاس صرف ایگزیکٹو کا کردار ہے' یعنی یہ صرف تنفیذی اور انتظامی قوت ہے۔ شہریوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی تشکیل میں رائے دیں اور ناپسندیدہ حکومت کو بدلنے کے لیے عوامی تحریک چلائیں۔ البتہ حکومت کی تبدیلی کا ایک جمہوری یعنی انتخابی طریق کار ہے اور ایک انقلابی یعنی احتجاجی طریق کار۔ نظام میں بنیادی تبدیلی احتجاجی طریق کار ہی سے ممکن ہے۔ اِس طریق کار کے حوالے سے شہریوں کا حق ہے کہ وہ جماعت سازی کریں' پُرامن مظاہرے کریں' گھیراؤ کریں اور دھرنے دیں۔ گویا تمدنی ارتقاء نے ایک دروازہ بند کیا ہے تو دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ آدمی کو اگر اِن چیزوں کا شعور نہ ہو تو بھی وہ شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں کیا کرے اور کیسے

کرے؟ اِس سیاق وسباق میں نہی عن المنکر کی جو اہمیت قرآن وحدیث سے ہمارے سامنے آتی ہے اِس کو سمجھنے کے لیے منتخب نصاب نمبر۲ میں اِس درس کو شامل کیا گیا ہے۔

◆ آج کے حالات میں اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام کا عنوان ہوگا ''نہی عن المنکر بالید اور حدود اللہ کی حفاظت''۔ یہ اقدام پُرامن اور غیر مسلح منظّم احتجاج کی صورت میں کیا جائے گا۔ اِس احتجاج میں کسی ایسے منکر کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہوگا جس کا خلافِ شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلّم ہو۔ مثال کے طور پر عریانی وفحاشی کی اشاعت' سودی معیشت کی ترویج وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کے پُرامن گھیراؤ اور سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اِن پُرامن اور منظّم مظاہروں کے ذریعے سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اُس منکر کا قلع قمع کرے اور اِس کے سدِّ باب کے لیے قانون سازی کرے۔ یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ پھر اِس طریقہ میں اقتدار کی طلب بھی نہیں' بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں منکرات کو ختم کرنے اور شریعتِ اسلامی کے مطابق قانون سازی کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر مظاہرین کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنے' تشدّد برداشت کرنے اور یہاں تک کہ جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ یہ طرزِ عمل اُن صحابہ کرام j کے اُسوہ کے مطابق ہوگا جنہوں نے مکی دَور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔

البتہ اِس طرح کے پرامن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ:

(۱) انقلابی جماعت نے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کی فرضیت' اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی اہمیت اور اُس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں' اور ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات دیے ہوں۔

(۲) انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں شریعت کے احکامات پر امکانی حد تک عمل کر کے اپنے سیرت وکردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس اُن کے قول وفعل کی مطابقت کے قائل ہوں۔ اُنہوں نے تزکیہ کے مراحل طے کیے ہوں' اُن کا مطلوب ومقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اُخروی ہو' اور اُن کے دل راہِ حق میں جان دینے کے لیے بے چین ہوں۔

(۳) انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں احکامات سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظّم ہو۔ مختلف مناصب پر تربیت یافتہ افراد فائز ہوں اور کارکنان نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آکر پرامن احتجاج کا آغاز کرنا چاہیے۔

◆ پرامن اور منظّم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہوسکتے ہیں :

(i) حکومت اِن مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کردے۔ اِس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

(ii) حکومت انقلابی تحریک کو اپنے خلاف انا کا مسئلہ بنالے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ کے لیے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اِس صورت میں حکومت پر قابض مفاد یافتہ طبقات' ریاست کی پولیس' فوج اور وسائل کو اِس تحریک کے خلاف بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی' آنسوگیس کے شیل پھینکے جائیں گے' گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی؟ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی دینی بھائی اور ہم وطن ہیں۔ یہ کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اُس کے نفاذ کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ اُلٹ جائے گا اور' اِن شاء اللہ' انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ ماضی قریب میں اِس کی ایک مثال موجود ہے۔ ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے دوران پاکستانی فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اُس وقت چونکہ کوئی ایک منظّم جماعت اقتدار سنبھالنے کے لیے موجود نہ تھی' لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

(iii) اگر حکومتِ وقت اِس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوجائے تو جن لوگوں نے اِس

راستے میں جانیں دی ہوں گی' اُن کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ ان شاء اللہ وہ اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے۔ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں' البتہ اُس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں' اِن شاء اللہ اِنہی جان نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے جلد یا بدیر کوئی نئی اسلامی انقلابی تحریک اُبھرے گی جو طاغوتی، استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی۔ اِس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق ﷺ نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔ گویا: ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

موجودہ دور میں غلبۂ دین کا یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح سیدھا اور واضح راستہ ہے۔ انسان کے دل میں اگر چور ہو تو وہ جدھر سے چاہے چور دروازہ بنائے اور نکل جائے' لیکن یہ بالکل سیدھا راستہ ہے' سیدھا تصور ہے۔ اس میں کہیں جھول اور ہیر پھیر نہیں ہے' اِس میں کہیں تکلف اور تصنع نہیں ہے۔

کیا موجودہ دور میں قتال فی سبیل اللہ جائز نہیں؟

نبی اکرم ﷺ کے دَور میں آخری مرحلہ مسلح تصادم یعنی قتال فی سبیل اللہ کا تھا۔ اُس زمانے میں جہاد بالید کے معنی قتال ہی کے تھے' کیونکہ اُس وقت موجودہ سیاسی ادارے وجود میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی مظاہروں (demonstrations) کا کوئی طریقہ موجود تھا۔ یہ موجودہ دور کی صورت ہے کہ قتال کے ذریعے کامیابی کا امکان نظر نہیں آ رہا اور مجبوراً عوامی دباؤ کے ذریعے مظاہروں' سول نافرمانی اور گھیراؤ کی صورت میں آخری اقدام کرنا پڑ رہا ہے۔ جہاد کی اعلیٰ ترین صورت قتال فی سبیل اللہ ہی ہے' اور اگر کامیابی کا امکان نظر آئے تو اِسی کو اختیار کرنا سنتِ نبوی ﷺ پر عمل ہے۔ آنجہانی غلام احمد قادیانی کا یہ تصور گمراہی ہے کہ: ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

قتال فی سبیل اللہ ہر دور میں جائز رہے گا۔ اگر کچھ کلمہ گو لیکن فساق و فجار مسلمان دین کے راستے کے اندر ایک رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے ہوں اور آپ نے باقی سارے تقاضے پورے کر لیے ہوں تو کیا اُن کی جانیں اتنی مقدس ہیں کہ اُن کی وجہ سے دین کو پامال رہنے دیا جائے؟ یہ بات نہ عقل کی میزان پر پوری اترنے والی ہے اور نہ نقل کی میزان پر۔ امام ابوحنیفہؒ کا موقف صد فی صد درست ہے کہ مذکورہ شرائط پوری ہو رہی ہوں تو کلمہ گو فاسق حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے جا سکتے ہیں۔ البتہ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے سنت نبوی ﷺ کے مطابق تبلیغ' اپنے ذاتی کردار اور برائی کا جواب اچھائی سے دے کر مخالفین پر حجت تمام کرنا ہوگی۔

حواشی

(١) صحیح البخاری' کتاب الاشربة' باب قول اللّٰہ تعالی **اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ** ...... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی......

(٢) مسند احمد' مسند الانصار' ح : ٢٠٩٥١

(٣) سنن ابن ماجه' کتاب التجارات' باب التغلیظ فی الربا۔

(٤) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن عن رسول اللّٰه ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

(٥) سنن الترمذی' ابواب المناقب' عن رسول اللّٰه ﷺ' باب مناقب اهل بیت النبی ﷺ۔

(٦) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔

(٧) صحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرها' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه......

(٨) سنن الترمذی' ابواب الفتن عن رسول اللّٰه ﷺ ' باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر۔

(٩) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان......

(١٠) رواه البیهقی فی شعب الایمان: ٢٥٧١/٦۔

(١١) صحیح مسلم' کتاب الایمان' حواله سابقه

(١٢) مسند احمد، کتاب باقِی مسندِ المثرِین، باب مسند نسِ بنِ مالِ

(١٣) صحیح الجامع الصغیر للالبانی: ٧١٧٩۔

(١٤) صحیح البخاری' کتاب الدیات' باب قول اللّٰه تعالی ومن احیاها......